ہم آگ چُراتے ہیں

وحید احمد

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

دستاویز، لاہور

دستاویز کی دستاویز کتابیں

اہتمام و اشاعت

اشرف سلیم

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: ہم آگ چُراتے ہیں

شاعر: وحید احمد

اشاعت اوّل: مارچ۔۲۰۰۲

اشاعت دوم:۔۲۰۱۵

مشینی کتابت: عدنان اشرف

سرِ ورق: حمدان خالد

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت: ۲۰۰ روپے

دستاویز

سی-159 چناب بلاک نمبر 10 علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون: 03334344716

ای میل: saleemashraf86@yahoo.com

فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

حافظ

دیگر کتب

☆:شفّافیاں (شاعری) پہلی بار ۱۹۹۴ء
☆:زینو (ناول) پہلی بار ۲۰۰۳ء
☆:نظم نامہ (شاعری) پہلی بار ۲۰۱۲ء
☆:مندری والا (ناول) پہلی بار ۲۰۱۲ء

فضل حسین راہیؔ کے نام

فہرست

۱	ہم شاعر ہوتے ہیں	۹
۲	ایک دُعا ہریالی کی	۱۳
۳	گھر سے باہر نکلنے کی تیاری	۱۶
۴	سارا دن	۱۸
۵	انتظار	۲۰
۶	سواگت	۲۲
۷	چھینٹے	۲۵
۸	او میرے یار	۲۶
۹	مرمّت کون کرتا ہے	۲۸
۱۰	مجھے اب اور نا سینا	۵۱
۱۱	علاج بالمثل	۵۵
۱۲	بنیاد ٹیڑھی ہے	۵۷
۱۳	کولاژ	۶۴

۱۴	کیسا لگتا ہے	۶۷
۱۵	آدھا رومال	۶۹
۱۶	THE DIVE	۷۳
۱۷	کیوں؟	۷۶
۱۸	مویشی	۷۹
۱۹	یوں ہے کہ	۸۴
۲۰	بَین	۸۵
۲۱	ہر مُلک مِلک ماست	۹۰
۲۲	خانہ بدوش	۹۱
۲۳	پھیلاؤ	۹۶
۲۴	لکیر میں رہ	۹۷

ساتھی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ہم شاعر ہوتے ہیں

ہم پیدا کرتے ہیں
ہم گیلی مٹّی کو مٹھی میں بھینچا کرتے ہیں
تو شکلیں بنتی ہیں
ہم ان کی چونچیں کھول کے سانسیں پھونکا کرتے ہیں
جو مٹّی تھے، وہ چھُو لینے سے طائر ہوتے ہیں
ہم شاعر ہوتے ہیں

کنعان میں رہتے ہیں
جب جلوہ کرتے ہیں
تو ششدر انگشتوں کو پوریں نشتر دیتی ہیں

پھر خون ٹپکتا ہے
جو سرد نہیں ہوتا
اک سہما سا سکتہ ہوتا ہے، درد نہیں ہوتا
یونان کے ڈاکو ہیں
ہم دیوتاؤں کے محل میں نقب لگایا کرتے ہیں
ہم آسمان کا نیلا شہ دروازہ توڑتے ہیں
ہم آگ چُراتے ہیں
تو اس دُنیا کی یخ چوٹی سے برف پگھلتی ہے
پھر جمے ہوئے سینے ہلتے ہیں، سانس ہمکتی ہے
اور شریانوں کے منہ کھلتے ہیں

خون دھڑکتا ہے
جیون رامائن میں
جب راون استبدادی کاروبار چلاتا ہے
ہم سیتا لکھتے ہیں
جب رتھ کے پہیے جسموں کے خاشاک کچلتے ہیں
تو گیتا لکھتے ہیں

جب ہونٹوں کے سہمے کپڑوں پر بخیہ ہوتا ہے
ہم بولا کرتے ہیں
جب منڈی سے ایک ایک ترازو غائب ہوتا ہے
تو جیون کو میزان پہ رکھ کر تولا کرتے ہیں
مزدوری کرتے ہیں
ہم لفظوں کے جنگل سے لکڑی کاٹا کرتے ہیں
ہم ارّکشی کے ماہر ہیں،
انبار لگاتے ہیں
پھر رندہ پھیرتے ہیں،
پھر برما دیتے ہیں،
پھر بدھ مِلاتے ہیں
پھر چُول بٹھاتے ہیں

ہم تھوڑے تھوڑے ہیں
اس بھری بھرائی دُنیا میں ہم کم کم ہوتے ہیں
جب شہر میں جنگل در آئے،
اور اس کا چلن جنگلائے
تو ہم غار سے آتے ہیں

جب جنگل شہر کی زد میں ہو
اور اس کا سکوں شہرائے
تو برگد سے نکلتے ہیں
ہم تھوڑے تھوڑے ہیں
ہم کم کم ہوتے ہیں

ایک دُعا ہریالی کی

وِردوں کی ہَم ٭، مدہم مدہم

دیواریں لرزاتی ہے
لال اگربتیوں کی سر چکرانے والی بھاری بھاری باس
دُھواں بن کر اُڑتی ہے
سبز ملنگوں کی گردِن میں کالے منکوں کی مالائیں
چوغوں کے اندھیارے شیشوں سے ٹکرائیں
کُند جَھنک دیں
سر دستون، عقیدت مندوں کے لمسوں سے میلے میلے
طاق، چراغوں کے رستے روغن کے نم سے گیلے گیلے

HUM

آسودہ، مخمور کبوتر
گنبد جن کا آنگن ہے

اور آنگن جن کا تہ خانہ ہے
چوڑی چوکھٹ والا، شہ دروازہ،
بھرے ہوئے لوگوں سے بھرا ہوا ہے

پیر سائیں،
وہ عورت تھی یا ساحرہ تھی
جب اُس نے تیرے دربار میں اپنے ننگے پاؤں دھرے
تو تیرے فرش کے مرمر نے رنگت بدلی
دیکھنے والے ٹھہر گئے
اور سننے والے چلنے لگے
اُس نے اپنی مخروطی انگشتوں والے ہاتھوں کا کشکول بنایا
اور لرزتے ہونٹوں سے سرگوشی کی۔۔۔

''بابا!
دیکھ! مَیں باہر سے کتنی آباد ہوں

لیکن میرے اندر اک ویرانہ ہے
میری کوکھ میں مٹّی اُڑتی رہتی ہے
پیرا! اس میں کالے کالے بادل بھیج
شُوکریں مارتی بارش کر
سُوندھی سُوندھی باس جگا
دونوں ہاتھ جما کر کھینچ
وتّر والی مٹی پھاڑ
چھوٹی بڑی دراڑیں ڈال
تا کہ کوئی کونپل اِس میں جڑ پکڑے
ہلکورے لے،
دھڑ پکڑے
سائیں،
مجھے ہریالی دے
پھُولنے پھلنے والی دے‘‘

گھر سے باہر نکلنے کی تیاری

اور پھر ریڑھ کی چوڑی پہ گِسا کاسۂ سر
کاسۂ چشم میں آنکھیں رکھ دیں
ہر بُنِ گوش میں آواز کا بالا ڈالا
ناک کا چھید کیا کِیل مشامِ جاں سے
آبِ حیواں جو پیا، سوئی زباں جاگ اُٹھی
روغنِ لامسہ تر کرتا گیا ہر بنِ مو
جسم کو ڈھال کیا کپڑوں کی دہری تہ سے
پاؤں میں چرم کا چکر پہنا
کوٹ کی جیب میں چہرے ڈالے
اور ہاتھوں پہ لکیریں رکھ دیں

پھر درِ ذات کو اندر کی طرف کھول دیا
گھر کے دروازے کو باہر کی طرف کھول دیا

سارا دِن

جب پھوٹی کونپل دُھوپ کی، ہم گھر سے نکلے
پھر شہر کی بہتی دھار میں، ہلکورے کھائے
اِک لہر کی دست درازیاں، ساحل پر لائیں
اِک ریستوران میں چائے پی، اور جسم سکھایا
اب دُھوپ درخت جوان تھا چھتنار ہوا تھا
سو ہم نے تنہا ریت پر تنہائی تانی
اور اس کے نیچے رنگ رنگ کی باتیں کھولیں
کچھ باتیں گزرے وقت کی، جو ہم نے دیکھا
کچھ آنے والے وقت کی، جو کس نے دیکھا
کچھ سرسوں دِن کھلیان کی، لچکیلی پیلی
شب آنکھیں سم پھنکارتیں، چمکیلی نیلی

کچھ شامیں رنگ اُچھالتی، گہرا نارنجی
کچھ روز و شب بیکار سے، بے جاں شطرنجی
جب گھر لوٹے تو شام کی، پت جھڑ ہوتی تھی
جو لمحہ لمحہ گرد تھی، کپڑوں سے جھاڑی
جو بہتی دھار کے خار تھے، پاؤں سے کھینچے
پھر دونوں نے دہلیز پر، آوازیں رکھ دیں
اور آنکھیں بجھتی روشنی، کے ہاتھ میں دے دیں

انتظار

بڑی مشکل سے دِن کاٹا
کبھی قہوے کے نشتر سے،
کبھی چائے کے آرے سے،
کبھی سگرٹ کی چھینی سے،
کبھی سوہان پانی کے کڑے تیز اب دھارے سے،
بڑی مشکل سے دِن کاٹا
بُرادہ وقت کا ہاتھوں سے جھاڑا
زرد گرد آلود پوریں،
جو گزشتہ دِن کے لمحوں سے اٹی تھیں
شام کے آنچل سے پونچھیں
اور پھر میں رات کے نمکیں نمیدہ بحرِ اسود میں اُتر کر

اُس سفینے کے لیے پتھرا گیا،
جس میں اُسے میرے لیے ساحل پہ آنا تھا

مَیں اب تک پنڈلیوں کی مچھلیاں پانی میں ڈالے
بحرِ اسود میں کھڑا ہوں
اور اُدھر دِنیا میں روزانہ،
سنا ہے دِن نکلتا ہے
سنا ہے رات ہوتی ہے

سواگت

گھر کا دروازہ کھلا
کتنے دِن بعد اُسے سانس آیا
کتنے دِن بعد اُسے اپنوں کی بچھڑی ہوئی خوشبو آئی
ماں نے پیشانی کو ہونٹوں سے چھوا
باپ نے سر پہ ہتھیلی رکھی

دو بھتیجوں نے اُسے سہما ہوا پیار کیا
طاق پر گزرے ہوئے بھائی کی تصویر ہنسی
سرد بھابھی نے ٹھٹھرتے ہوئے دو ہاتھوں کے باٹ
اُس کے جھکتے ہوئے شانوں کے ترازو پہ دھرے

اور میزان کی سوئی پہ نگاہیں رکھ دیں

اس کی ہمشیر نے بے ساختہ رفتار بھری
گیلے جوتوں نے فقط چند قدم ساتھ دیا
بھائی پھیلا وہ یکا یک ٹھٹھکی
پھر جھجکتے ہوئے، سمٹے ہوئے پہلو سے ملی

اس کی بیٹی نے ذرا دوڑ کر اِک جست بھری
ننھی باہوں سے گریباں کو رفو کر ڈالا
ہچکیاں لے کے بہت دیر ہنسی،
اور رو رو کے کھلونا مانگا

اس کا سویا ہوا بیٹا تھا کسی سپنے میں
جاگتے باپ کی خوشبو سے جو ٹکرا کے گرا
اس سے پہلے کہ اسے کھائی کی رات آ لیتی
باپ نے سینے سے لپٹا کے سحر کر ڈالی

اس کی بیوی نے مدارت کے لیے

برتنوں کو بڑی تیزی سے نکالا۔ رکھا
سرمئی چولہے کو بیدار کیا
اور پھر چھپ کے بڑے شوق سے سنگھار کیا

چھینٹے

شام کو ٹھوکر لگی
ہاتھوں سے سورج دان چھلکا
اِک کرن نیچے گری
چھینٹے اُڑے
کچھ سرمئی دیوار و دَر میں رُک گئے۔ جلتے رہے
کچھ کو پتنگوں کے پَروں نے لے لیا۔ چلتے رہے
کچھ آسماں کے جسم سے چمٹے رہے۔ ہلتے رہے
کچھ پانیوں میں گھل گئے
کچھ آنکھ میں آ کر رُکے
کچھ تھم گئے
کچھ ڈھل گئے

او میرے یار

آ رو
ہاں آ جا میرے سینے کی دیوار سے لگ کر رو
آ میرے سینے کے پتھر کو
اپنے دو ہتھڑ کی پے در پے ضربوں سے توڑ
آ مَیں تیری ویران آنکھوں کو کاندھے پر رکھ لوں
کیوں سسکی سسکی چھلک رہا ہے، کھل کر دھاڑیں مار
او میرے یار!

یہ کس نے تجھ کو چُپ تابوت میں زندہ گاڑ دیا
پھر اپنا اِک اِک نرم دلاسہ کیل بنایا ہے

یہ کس نے تیرے آگے دھاڑس کی دیوار چنی
پھر تیرے دونوں دریاؤں کو جھیل بنایا ہے
کیوں سینے کے کالے کمرے میں
غم کو ایک خزانے کی مانند چھپائے بیٹھا ہے
قارون!
بس اِک جھٹکے سے اِس بھاری صندوق کا تالا توڑ
پھر اپنی ساری دولت میرے سر کے اوپر وار
او میرے یار!
آ کنگالی اپنا
بے زر، بے ثروت ہو
ہاں آ جا میرے سینے کی دیوار سے لگ کر رو

مرمّت کون کرتا ہے

کراچی
رات کی گیلی ہوا میں سو رہا تھا
کیماڑی کا گھنا پتھریلا ساحل،
مچھلیوں کے حصّے بخروں،
تیل کی گہری لزوجت،
اور سارے شہر کی میلی کثافت کو بلو کر،
سانولا محلول پیدا کر رہا تھا،
کئی فرلانگ اندر،
گہرے پانی پر، اُچھلتی کشتیوں میں
سیاہ ساحل بان عملہ گشت کرتا تھا
جزیرے سانولے پانی کے اوپر سیاہ دھبے تھے

منوڑا پر معلّق نور مینارہ عمل میں تھا
ذرا ہی دور اِک ویران مندر کا بدن تھا
اور اُس کے سر پہ کالی کی ہتھیلی تھی
صلیبیں تن پہ چپکائے ہوئے گرجا کھڑا تھا
اور اُس کے گرد مریم کا ہیولا تھا
مزار، اتنی اگربتیوں میں بھیگا تھا
کہ خوشبو ساحلی پانی کے اوپر تیرتی تھی
مچھیرے مچھلیاں تھے
اور اُن کے گرد، خوابوں سے بھری نیندوں کا
گہرا جال کستا تھا
سمگلر اپنا دَھندا ختم کر کے مشرقِ وسطیٰ کی جانب
جا رہے تھے
دبیز عینک کے پیچھے موسمی حالات کی پیشین گوئی
ہو رہی تھی
کلفٹن، دُھند کا پشمینہ اوڑھے، اونگھتا تھا،
کسمساتا تھا
دھنسے مردہ جہازوں کے سیہ ڈھانچے، مسلسل عالم برزخ

میں زندہ تھے
نہ ان کو ریت کھاتی تھی
نہ ان کو دُھند پیتی تھی
بس اِک دو سُست سائے، ہاتھ میں چھڑیاں اٹھائے
چل رہے تھے
نیند جن سے روٹھ کر پانی کی تہ میں چھپ گئی تھی
سلیٹی مسجدوں کے چومکھی اسپیکروں میں
جب گجر دم فجر گونجی
تو سمندر نے سرکتے ساحلی تکیے پہ کروٹ پھیر کر
تاروں کی چادر تان لی
سورج ابھی کچھ دور تھا
لیکن کسی بے نام سے تیزاب سے،
کچی سیاہی کٹ رہی تھی
لرزتی،
کانپتی اِک نوک اُبھری
جو ترقّی کرتے کرتے اِک سفینہ ہو گئی
سرکاری عملہ جھرجھری لے کر اٹھا

شب بین آنکھوں سے لگائی
لڑکھڑاتا، سیاہ دھبّہ آنکھ میں فوکس ہوا
تو دیکھنے والے کی آنکھیں کھل گئیں
چٹخنی ہوئی
اِک آبنوسی چوب کی کشتی تھی
جس پر زنگ خوردہ دھات کا مستول تھا
قبل از مسیحی بادبانی چیتھڑوں کا
ایک بے تدبیر عرض وطول تھا
بھیگی ہوا مزدور تھی
سر پھینک کر، کشتی کو دونوں ہاتھ سے کھیتی ہوئی
ساحل کی جانب آ رہی تھی

عرش پر تھا عرش والا
اور عرشے پر زمیں والا تھا
جس کے بت کے اندر اَن گنت صدیوں کی دانش
سانس لیتی تھی
جسے ہر دور میں دُنیا پرستوں نے،

کبھی کڑوا ہر اسیّال دے کر نیل کر ڈالا
کبھی ہاتھ اور پاؤں میں گڑی میخوں کے رِستے خون سے
دھرتی رنگی
سُولی اجاگر کی
کبھی زندہ بدن سے کھال کھینچی، بیچ چوراہے میں
پتھر خلق کے آگے
کبھی دِل کی جگہ سینے میں جلتی گولیاں بھر دیں
مگر ہر بار اس کے جسم کو ٹھنڈا کیا
کہ سانس جو بیدار سینے سے نکلتی ہے
کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی
ہمیشہ بات بنتی ہے
چمکتی بات، جس کو دیکھنے کا یارلوگوں میں نہ یارا تھا،
نہ شاید ہے، نہ شاید ہو

جب اُس کے پاؤں ساحل پر پڑے
تو ایک سوفسطائی وردی دار نے سختی سے پوچھا
کون ہے؟

''سقراط''

پورا نام کیا ہے؟

وردی والے نے قلم کا زاویہ کاغذ پہ پختہ کر کے پوچھا

''نام ہے یا چاند ہے؟ آدھا، کبھی پورا

کہو، کیا نام آدھا بھی ہوا کرتا ہے؟''

ہاں

سقراط آدھا نام ہے

سقراط علی، سقراط احمد، چوہدری سقراط چیمہ،

اپنا پورا نام لکھواؤ، یہ سرکاری ضرورت ہے،

''تمھارا نام کیا ہے؟''

تم کو اس سے کیا؟

''مجھے ہے۔۔۔؟

ٹھیک ہے۔ صفدر علی ہے نام میرا،

''اور آدھا نام۔۔۔؟''

''صفدر''

''خوب، علی کے بعد بھی تم نام کو آدھا سمجھتے ہو

یہ کس انداز کی ذہنی سہولت ہے

علی خارج ہوا، تو صفدری کتنی رہی باقی

کبھی سوچا بھی ہے تُو نے

سو مَیں سقراط ہوں۔۔۔ تنہا

نہ میرا سابقہ کوئی

نہ میرا لاحقہ کوئی

سنہرے رنگ کے سورج نے،

گہرے نیل کی چٹکی

سمندر کے کھلے برتن میں پھیری

دِن کا میلا شب زدہ فرغل کھنگالا

پھر جھٹک کر آسماں کے تار پر پھیلا دیا

چبھتی ہوئی نظریں لیے،

اِک منحنی میلا سپاہی راستے میں آ گیا

کاندھے سے لٹکی پوٹلی کی گانٹھ پر

پتلی چھڑی کے بید سے لچکیلی دستک دے کے بولا

''او بزرگا

مَیں مسلسل ایک گھنٹے سے تری مشکوک حالت پر

نظر رکھے ہوئے ہوں
پوٹلی میں چرس ہے یا ہیروئین ہے؟
شہر میں اڈّہ کہاں ہے
اور باہر کس جگہ پر رابطہ ہے
سچ بتا دے
ورنہ تیری کھال کا جوتا بنا کر مَیں کراچی شہر ناپوں گا''
ذرا سا سوچ کر سقراط بولا
'ہاں
مجھے جوتے سے یاد آیا
مرمّت کون کرتا ہے'
''مرمّت!
جب تیرے پاؤں میں رسا باندھ کر،
تھانے کی چھت سے اُلٹا لٹکایا
تو پھر معلوم ہوگا کہ مرمت کو کرتا ہے''
ہزاروں سال آنکھوں میں لیے سقراط نے نظریں سپاہی میں
اُتاریں اور پوچھا
جب کبھی جوتا بگڑ جائے

جب اُس کی کھال اُکھڑے
اور بخیئے ٹوٹ کر بے سمت ہو جائیں
تو اس بے کار جوتے کی مرمت کون کرتا ہے؟
سپاہی کی ہتھیلی سے چھڑی ساحل نے لے لی
اور وہ لکنت زدہ لفظوں کو باہم جوڑ کر بولا
''مرا مطلب ہے۔۔۔۔جی۔۔۔موچی۔۔۔بزرگو''
'اور جب انگشتری کا زر چیخ جائے
مرمّت کون کرتا ہے؟
''جی۔۔۔سُنیارا''
'کبھی لکڑی کے فرنیچر کی چولیں نرم پڑ جائیں
کتھئی رنگ سے لبریز میخیں پرورش کرنے لگیں
باہر نکل آئیں
کہولت سے بھرے جوڑوں کی جنبش چیخ بن جائے
تو اس بے کار لکڑی کی مرمّت کون کرتا ہے؟
''بڑھئی''
'اور پھر
جب مملکت کا وہ سفینہ

جس میں ساری قوم بیٹھی ہو
مسلسل بحر کی طغیانیوں سے
تیرتے حشرات کی بسیار خوری
اور لمبی مچھلیوں کے وار سے بیکار ہو جائے
تو اس بگڑے سفینے کی مرمت کون کرتا ہے۔۔۔؟؟'
سپاہی ریت میں دھنستا گیا
بس کانپتا چہرہ ہوا میں رہ گیا

پھُولے پپوٹوں میں لرزتی، سرخ آنکھوں کے کواڑوں
سے مسلسل جھانکتا اِک شخص
ساری گفتگو کو سن رہا تھا
معتبر انداز میں گویا ہوا
''سقراط جی!
مَیں فلسفے کا مستند استاد ہوں
اِس ملک میں
مَیں اور لوگوں کے علاوہ آپ کی تعلیم بھی بچوں کو دیتا ہوں
جہاں بھر کے بہت سے فلسفی،

تحقیق زیادہ با اثر کرنے کی خاطر
میری رائے کو کتابوں میں جلی حرفوں سے لکھتے ہیں
بھلا اَن پڑھ سپاہی
قتل، چوری کے وقوعہ کے علاوہ
آپ سے کیا گفتگو کر پائے گا
چھوڑیں اِسے
مَیں گفتگو کو پھر وہیں سے چھیڑتا ہوں
آپ کی یہ پوٹلی کیا ہے؟''
''پروفیسر!
مری اِس پوٹلی میں وقت کے ٹکڑے ہیں
لمحوں کا بُرادہ ہے
کئی صبحوں کی قلمیں ہیں
کئی شاموں کا چُورا ہے
تجّی کی پرانی دھجیاں ہیں
جو ہُوا
اس میں بھرا ہے
اور جو ہونا ہے۔۔۔۔اِس میں ہے'

''مگر سقراط جی!
یہ وقت کے ٹکڑے یہ لمحوں کا بُرادہ
بُھربُھرے، بیکار، دقیانوس وقتوں کے جلے لفظوں کی
میلی راکھ ہے
اور آپ اِس کو ساتھ والے ملک میں جا کر
اِسی سہ پہر گنگا میں بہا دیں
تو بھلا ہوگا
مجھے معلوم ہے اِس پوٹلی میں کیا ہے
فیثا غورثی صوفی پہیلی در پہیلی ہے
پروٹا گورسی شکوے گلے ہیں، ابتلائیں ہیں
کہیں تھیلیز کا پانی
کہیں جلتے ہیر کلیٹس کی چنگاری
پھر آخر آپ کیا ہیں
رات دِن، بیکار، گلیوں میں اُبھرتے کچے ذہنوں سے
اُلجھنا،
پختہ سوچوں کی فصیلوں سے جو ٹکرانا
تو گر کر پاش ہو جانا

دعائیں دیجے افلاطون کو
یا فوجی زینوفان کو
جو آپ کو لفظوں میں لے آئے
وگرنہ آپ بھی اِس پوٹلی کی راکھ میں ہوتے''
'پروفیسر
میری اِس پوٹلی میں عہد نامہ ہے
پرانا عہد نامہ بھی، جو کوہِ طور پر اُترا
نیا بھی
جس کے حرف وصوت کو انجیل کہتے ہیں
مری اِس پوٹلی کو اہلِ دل نبیل کہتے ہیں
کہ اِس میں وید کے اشلوک ہیں
زرتشت کا بن باس ہے
بُدھا کا پنجر ہے
تمھاری دھڑکنوں میں گونجتا ایمان ہے
قرآن ہے۔۔۔'
''سقراط جی
گر آپ نے جذبات بھڑکانے ہیں

تو لونڈوں سے ہی باتیں کیا کیجے
ہمارے علم کا کچھ تو صلہ دیجے
کہ ہم نے بھی تو آخر آپ کی مانند ستّر سال کا پھیرا نکالا ہے
یہ چاندی،
جو ہمارے سر میں اُتری ہے
کتابوں کی کڑی دوپہر نے دی ہے
کمال آفتاب و ماہتاب اس میں نہیں ہے
تو!
ہمارے ساتھ منطق کیجیے، ٹھنڈے لب و لہجے سے
جو کہ صاحبانِ علم کا ازلی وطیرہ ہے''
'پروفیسر!
مجھے تم فلسفی کس واسطے کہتے ہو،
جب مَیں بات کرتا ہوں،
کبھی لکھتا نہیں
جب بات سنتا ہوں کبھی لکھتا نہیں
محسوس کرتا ہوں، تو لکھ لیتا ہوں
دلِ قرطاس کرتا ہوں

لہو کی روشنائی کے علاوہ میرے لفظوں میں کوئی
رنگت نہیں۔۔۔تو میں کہاں کا فلسفی؟'
''سقراط جی!
اب چھوڑیئے بھی!
آپ ہی کے نام سے تو ہم سخن آغاز کرتے ہیں
اگرچہ اختلاف اپنی جگہ
لیکن یہ ممکن ہی نہیں
کہ فلسفے کی بات چھیلے
اور وہ سقراط سے محروم رہ جائے''
'پروفیسر!
سمندر اور دریا مختلف ہوتے ہیں

سو
سقراط بھی تو مختلف ہے فلسفہ سازوں کے دھارے سے
کہ جس کا اک کنارہ ڈھونڈیئے
تو کھوج میں پہلا بھی کھو جائے،
''مگر سقراط جی

مُردارِ بحرِ بے اماں بھی تو ہُوا کرتا ہے
جس میں مچھلیوں کی سانس پانی میں نہیں چلتی۔۔۔''
'پروفیسر
سمندر مر بھی جائے تو سمندر رہے
کبھی دریا نہیں ہوتا
اسے دھرتی میں دفنانے کی کوشش کی
تو کیا ہوگا
کتابوں سے کبھی فرصت ملے
تو پھر کبھی ساحل پر آ کر سوچنا
کس برِّ اعظم کی زمیں کو کھود کر پانی اتارو گے
کدالیں کون لائے گا
عموداً کون سی دھرتی کھڑی ہوگی
کہ لوحِ قبر بن جائے'
پروفیسر نے سوچا
اور پھر سقراط کے چہرے سے نظروں کو ہٹا کر گفتگو کرنے لگا
''سقراط جی
ہم گفتگو کو موڑ دیتے ہیں

زمانہ تیز رفتاری سے بڑھ کر برق رفتاری کی زد میں ہے
پرانے دور کے اسپارٹا، ایتھنز ہجرت کر کے
واشنگٹن ہوئے ہیں، ٹوکیو کہلائے جاتے ہیں
چنانچہ، سوچ کا دھارا بدلتا جا رہا ہے۔
شعوری، لاشعوری اور سب تحت الشعّوری
خام سوچیں
اب نئی بھٹی میں گلتی اور ڈھلتی ہیں
بھلا مَیں آپ کو کیا کیا بتاؤں
جوہری ہتھیار
سرد و گرم جنگیں
چاند سے آگے جو سیّارے ہیں
اُن پر زندگی کو ڈھونڈتی ٹیلی سکوپیں
سبزیوں کے بعد'
انسانوں کے خلیوں کو بدلتی
تجربہ گاہوں کے اندر پرورش کرتی کلوننگ
موسموں کے ساتھ سِکّوں کے بدلتے رنگ
بنکاری،

مرکّب سود، جس کی بھیڑ میں انسان مُفرد ہو کے رہ جائے۔
خیالوں میں مچلتی
سرحدوں کو توڑ کر جغرافیہ تعمیر کرتی اشتراکی منڈیاں
پرواز کرتی آسماں چھُوتی ہوئی افراطِ زر
سرمایہ کاری کے نئے رجحان
کمپیوٹر کے پیہم معجزے
ترسیل کا برقی نظام
اندوہ کرتے مشورے
میکانکی انداز میں
محنت کے رستوں پر نکلتے جسم
جن کے پاس
فکرِ ذات کو لمحہ نہیں۔۔۔۔
اور آپ تو فارغ ہُوا کرتے تھے
گلیوں میں نکل کر بات کرنے کے لیے
لوگوں کی شطرنجی دلیلیں مات کرنے کے لیے
سقراط جی!
اُس وقت میں اور آج میں صدیاں گنیں

صدیوں کی کارستانیاں دیکھیں
تو یہ جو آپ کے اندر اُچھلتا چھل سمندر ہے،
چھناکے سے اُڑے۔۔۔ بادل میں ڈھل جائے‘‘
’پروفیسر
وہی انسان ہے، جو تھا
وہی آنکھیں، وہی چہرہ
وہی پنجر پہ لپٹا ماس، جنبش کھینچتا، چلتا
وہی شریان در شریان ٹھاٹھیں مارتا گہرا لہو
صدیوں نے جس کا رنگ نہ بدلا
وہی انسان کی کھالوں میں لپٹے بھیڑیئے
جن کے لبوں پر
اپنے ہم جنسوں کے جسموں سے ٹپکتا خون ہے
پھر خوں کی نمکینی، کمیّت اور لزوجت بھی وہی
پہلے تو وہ گلّے سے اک دو ہی چنا کرتے تھے
باقی چھوڑ دیتے تھے
تمھاری اِس صدی میں سارا ریوڑ کام آتا ہے
کبھی جنگِ عظیم اوّل

کبھی جنگِ عظیم آخر
شعاعوں سے بھرا اِک دائرہ گرتا ہے،
لوہے کے پرندے سے
پھر اس کے بعد کی نسلیں خسارہ ہی خسارہ ہیں
کسی ننھی ہتھیلی کے تنے پر اُنگلیوں کا پنج شاخہ تک
نہیں اُگتا
کوئی آدھی بصارت سے زمانہ دیکھتا ہے
مسکرانے اور رونے کے لیے
ہونٹوں کے کونے تک نہیں ہلتے
کہیں اِک پوٹلی سونے کے بدلے سلطنت گروی
کہیں جب ناف کٹتی ہے
تو بچے کے گلے میں قرض کی زنجیر پڑتی ہے
کہیں بالشت جتنا ملک
اربوں ہانپتے سینوں میں سانسیں بانٹ دیتا ہے
کبھی جھٹکے سے سانسیں اس طرح سے کھینچ لیتا ہے
کہ جیسے عرش پر اس کے سوا کوئی نہیں بیٹھا
جنھیں تم میر جعفر، میر صادق کا لقب دشنام کرتے ہو

بہت معصوم تھے وہ لوگ
اُن کا شر بڑا محدود تھا
اب اِس گھرانے کے چراغ و چشم اپنے دستخط سے
اَن گنت سینوں کی سانسیں بیچ دیتے ہیں
تم اپنی سانس سے پوچھو
تمھاری ہے
اُدھاری ہے
یا گروی ہے۔۔۔؟
وہی انسان ہے، جو تھا
بس اِک وحشت میں کاری ہو گیا
ورنہ،
وہی انسان ہے، جو تھا
ہماری بات لمبی ہو رہی ہے
مختصر یوں ہے
کہ کوئی ملک دھرتی کے خزانوں میں نہائی کوکھ سے
غربت لیے پیدا نہیں ہوتا
غریب اُس کو وہاں کے لوگ کرتے ہیں

اگر دانش کے دھارے زہر سے لبریز ہو جائیں
تو اُن کی تہہ میں اُجلی مچھلیاں رنگت بدلتی ہیں

پروفیسر!
کسی بھی ملک کے دانشوروں کی سوچ میں
اِک بار جب غربت اُتر آئے
تو صدیوں چاہئیں
اس ملک کے ماتھے پہ چپکی مفلسی کی رات دھونے کو
اگر سورج نچوڑو گے
تو اِک قطرے کے آگے کچھ نہیں ہوگا،
پروفیسر سپاہی کی طرح ساحل کی گیلی ریت میں دھنستا گیا
بس کانپتا چہرہ ہَوا میں رہ گیا

پھر شام کو
سقراط جب واپس سمندر کی طرف بڑھنے لگا
تو جسم سارے ریت میں اُترے ہوئے تھے
ہر طرف چہرے ہی چہرے تھے
صلیب اِک شخص کے ہونٹوں پہ چسپاں تھی

جبیں کوئی تِلک والی
کسی کے سر پہ ٹوپی تھی
کسی چہرے پہ داڑھی تھی
کسی کے کیس لمبے تھے
مگر بچے زمیں کی کھینچ سے محفوظ تھے
وہ کھیلتے تھے
اُن کی ہر گردِن میں
اِک زنجیر تھی جو جھنجھناتی تھی
اُدھر سقراط کشتی کی طرف چہروں پہ چلتا جا رہا تھا
اِدھر بچے اسے آواز دے کر کہہ رہے تھے
''ہمیں معلوم ہے بابا!
مرمّت کون کرتا ہے؟
اگر جوتا بگڑ جائے
اگر سونا چٹخ جائے
اگر لکڑی تڑخ جائے
ہمیں معلوم ہے بابا۔۔۔
ہمیں معلوم ہے۔۔۔''

مجھے اب اور ناسِینا

وہ تیزی سے اُدھڑتا جا رہا تھا
ہر اِک دِن اُس کے بخیوں سے اُلجھ کر رات ہو جاتا
وہ روزانہ
بساطِ روز و شب پہ سانس کے مہرے چلا کر مات ہو جاتا
وہ سینہ کھول دیتا اور گہری سوچ میں رہتا
''یہ سینہ ہے
کہ تجریدی مصوّر کی کوئی تصویر ہے
جس کے دھڑکتے کینوس پہ بال بکھرائے
لکیریں چیختی ہیں
اور نقطے بین کرتے ہیں
یہ گھاؤ میرے اپنے خون نے مجھ پر لگایا تھا
مِرے بھائی،
جنھیں مجھ سے زیادہ باپ کی جاگیر پیاری تھی

یکا یک پاس آئے اور مجھ کو چیر کر دو لخت کر ڈالا
مِری ماں نے مجھے جوڑا
پھر اپنے بازوؤں کے نرم سڑیچر پہ رکھا
اور اپنے آنسوؤں کا تار دھرا کر مجھے بخیہ لگایا تھا
یہ وہ گھاؤ ہے

یہ پھٹ اُس چوٹ کا ہے
جو زمانے نے لگائی تھی
مَیں جب تعلیم سے فارغ ہوا
تو
میرے دونوں ہاتھ سورج کی طرح چمکا دیتے تھے
بڑے لوگوں کے لَو دیتے اقوال روشن تھے
عقیدے کی چمک دیتی ہوئی قندیل جلتی تھی
مگر مجھ پر کھلا
کہ دو جہاں اِک دوسرے سے مختلف ہیں
اور ان کے درمیاں مکتب کا پھاٹک ہے،
مجھے مکتب نے روکا تو زمانے نے مجھے کھینچا
نتیجتاً میں ٹوٹا
اور پھر علم و عمل کی ملگجی سرحد پہ گر کے پارہ پارہ ہو گیا

پھر وقت نے ہاتھوں میں سوزن لی
زمیں کے گھومتے گولے سے اِک دھاگہ نکالا

اور سینے لگ گیا
اُس نے مِرے ادراک کو باریک ٹانکے سے سیا
وجدان کے ایک ایک روزن پہ رفو کا ڑھا
بلا کا بخیہ گر ہے وقت
آفت کا رفو گر ہے
وہ سیتا بھی ہے سمجھتا بھی ہے
''او بے خبر!
دیکھو،
یہ دِنیا درمیانی ذہنیت کے، مصلحت جو، کُند لوگوں کے لیے
پیدا ہوئی ہے

یہاں حسّاس ہونا ایک ایسا جرم ہے
جس کی سزا کوئی نہیں دیتا،
بس اپنے آپ ملتی ہے
ذرا احساس کو تم آبگینے کی طرح دہلیز پر رکھو
تمھیں معلوم ہو جائے گا، پامالی کسے کہتے ہیں
کیوں کہ لوگ ریوڑ کی طرح پاؤں سے چلتے ہیں
نگاہوں سے نہیں چلتے''
وہ سینہ کھول دیتا اور گہری سوچ میں رہتا
''مِرا احساس چکنا چور ہے پھر بھی چمکتا ہے
مِرے سینے کے سب ٹانکے کھنچے ریشوں کے ہاتھوں سے
پھسلتے جا رہے ہیں

مجھے اب اور نہ سِینا
مِرا سینہ نہ سِینا
اب تو اس میں سانس بھرنے کی جگہ باقی نہیں
ٹانکا بھلا کیسے بھرا جائے''

ساتھی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

علاج بالمثل

دوا بالمثل بے توقیر روگوں، بے حمیّت عارضوں کے واسطے
بے مثل ہوتی ہے
کئی عشرے ہوئے ہم جاں بلب ہیں
اور مسلسل اس دوا پر ہیں

ہمیں دیکھو!
ہمیں معتوب کہتے ہیں
ہمیں مجرم بنا کر وقت نے کیسی عدالت کی
کہ شہرِ جاں سے ہم چہرہ بدر ہو کر
تپکتے تنگ سینوں میں جلاوطنی کی سانسیں کھینچتے ہیں

ہمیں دیکھو!

بڑے بے آسرا ہیں ہم
ہمارا گھر ہے لیکن کس قدر بے خانماں ہیں ہم
بڑے حیدر علی آتش، بڑے برگشتہ قسمت ہیں
کہ گھر کو آگ لگتی ہے تو ہم پانی بجھاتے ہیں☆
ہم اپنی دشت ویرانی مٹانے کے لیے صحرا کو جاتے ہیں
ہم اپنے ایک قرضے کو چکانے کے لیے
اِک دوسرا قرضہ اُٹھاتے ہیں
دوا بالمثل کھاتے ہیں

☆ برگشتہ طالعی کا تماشہ دکھاؤں میں
گھر کو لگے جو آگ تو پانی بجھاؤں میں
(آتش)

بنیاد ٹیڑھی ہے

بھلے وقتوں کی باتیں ہیں
بس اِک لمحہ ہوا کرتا تھا
جس کو لمحۂ موجود کہتے ہیں
بس اِک احساس ہوتا تھا
کہ حسِ مشترک کہیئے
بس اِک خودرو ضرورت تھی
کہ جینا ہے
بس اِک اندھی تھکاوٹ تھی
کہ مرنا ہے
نہ جینے کا کوئی صدمہ

نہ مرنے کی کوئی شادی
پھر اِن دو حالتوں میں فرق ہی کب تھا
بس اِک ہی رُوح ہوتی تھی۔۔۔۔رُوحِ کائنات
پرانے لوگ تھے
نو واردانِ حلقۂ ادراک تھے
ہلتے ہیولوں کی تجسّی تھی
حروفِ مہملہ میں بات کرتے تھے
مسلسل تنگنائے فہم میں جب پانچ حِسّیں تنگ پڑنے لگ گئیں
تو جھرجھری لے کر
مخمّس کی ہری کونپل سے شش پارہ اگا تھا
خام خلیوں کے بطن نوزائیدہ چھیالیسویں سیدھے کروموسوم کی
کنڈلی بناتے تھے
کہ اس میں خم بھرے ایسے
کہ وہ باقی کروموسوم جسموں سے شباہت کر سکے۔
مرد بے موسم ہوئے تھے
عورتوں کے موسمی جسموں نے کچھ ہی دیر پہلے خونچکانی کا ہنر سیکھا تھا
پھر اس پر ہر مہینے

اِک تواتر سے عمل پیرا ہوئے تھے۔
مسلسل کشت سے سرپوش جب
گردن کی لچکیلی صراحی پر توازن کر گیا
تو کھوپڑی میں سرسراتی لہر جاگی تھی
بدن کے خلیئے خلیئے سے نکلتی برق مقناطیس لہروں نے بتایا
وقت آ پہنچا ہے اپنے آپ کو اعلان کرنے کا
چنانچہ آدمی نے پاؤں کے ناخن سے دھرتی پر خطِ پرکار کھینچا
اجنبیّت کا
پرندے جھولتی شاخِ قرابت سے اُڑے اور دور جا بیٹھے
پریشاں جانور اگلے قدم پیچھے ہٹاتے ہٹ گئے اور چھٹ گئے
حشرات جب پاتال کی جانب سفر کرنے لگے
تو اُن کے بِل پانی کے اندر کھل گئے
پیڑوں نے اپنا جسم جھٹکایا تو بے چاری ہوا سوکھے ہوئے
پتوں پہ منہ کے بَل گری
پھر اِک بگولے میں لپٹ کر اُڑ گئی تھی
پتھر ذرا سی دیر کو پانی ہوئے، پھر منجمند ہوتے ہوئے پتھرا گئے

ویسے تو ہر اِک دور میں سوڈیڑھ سو انسان ہوتے ہیں
بقایا بھنبھناتی بھیڑ ہوتی ہے
جھمکتا جمگھٹا، سانسیں اُگلتا اژدھام اور ہونکتا ہنگام ہوتا ہے
یہی سوڈیڑھ سو انسان پڑیاں بانٹتے پھرتے ہیں۔
باقی لوگ تو قسمت کی پڑیاں کھول کر اُن پر عمل کرنے کی
رہ میں خرچ ہوتے ہیں
مگر جب اوّل اوّل حلقۂ ادراک کھینچا جا رہا تھا
اس گھڑی بس چار ہی انسان تھے
جن کی نویلی کھوپڑی میں سرسراتی لہر جاگی تھی
انہی ہاتھوں کے لمسِ اوّلیں نے خشت در خشت
ایک قصرِ فہم کی بنیاد رکھی تھی
وہی کہنہ عمارت جس میں ہم سب ہیں
پرانے لوگ تھے
اُجلی نفاست سے بنے اوزار کب تھے
پتھروں کو خشت کرنے کے لیے پتھر ہی استعمال ہوتے تھے
تغارے ہاتھ کے پیالوں کے تھے
اور اُنگلیوں کی کج کرنڈی ادھ گندھا گیلا مسالا

کھود کر دیوار کی درزوں میں رکھتی تھی
ہتھیلی گرم کر مالا لگا کر پھوٹتی دیوار کو ہموار کرتی تھی
مگر جب چار دیواری اُ گی
تو چار معماروں نے اپنی آنکھ کا شاقول دھرتی پر گرا کر غور سے دیکھا
کہ اُ س میں کج بھرا ہے۔
حروفِ مہملہ میں مشورہ ہونے لگا
''آخر سبب کیا ہے
کہ قصرِ فہم و دانش کی ہر اِک دیوار ٹیڑھی ہے
سبھی اینٹیں برابر گھڑ کے رکھی تھیں
سہج کی نرم مٹی میں لچکتا انہماک اتنا ملایا تھا
کہ اینٹیں جڑ کے اِک وحدت میں پتھرائیں''
یکا یک چاروں نظریں اتفاقِ رائے سے چمکیں
''کہیں بنیاد میں اِک اینٹ ٹیڑھی لگ گئی ہے''
مگر بنیاد میں جو چار پتھر تھے
جسامت میں برابر تھے
کہ جیسے ایک پتھر ماں کے جڑواں چار بچے ہوں
یہی بس چار پتھر تھے

تجسّس کا چمکتا کوندتا سنگِ ستارا تھا
ہوس کا لوچ دیتا سنگِ لرزاں تھا
پھر اِک سنگِ سلیماں ذاتی ملکیت کا تھا
اور آخری سنگِ شجر تھا جس پہ کائنات کا شجرہ بنا تھا
اور انساں اس کے مرکز میں نمایاں تھا
پرانے لوگ تھے
نو واردانِ حلقۂ ادراک تھے
ناعاقبت اندیش تھے
اِس خوف سے کہ از سرِ نو قصر کی تخریب کر کے
تازہ بنیادیں بھریں
ان کے دلوں میں زلزلہ آنے لگا
''جاری رہے تعمیر اور بالا رہے انسان'' کا نعرہ لگا کر
چار معماروں نے اپنے کام کو جاری رکھا اور مر گئے
لیکن وراثت سنگِ خارا کی طرح مضبوط ہے
ہر دور میں سو ڈیڑھ سو معمار قصرِ فہم کی تعمیر کو آگے بڑھاتے ہیں
ہزاروں منزلیں ہیں قصرِ فہم و آگہی کی
ایک اوپر ایک بنتی ہے

لطیفہ ہے کوئی زینہ اتر کر نچلی منزل کو نہیں جاتا
بس اوپر کام ہوتا ہے
اِدھر چھت کے بدن پر گیلی مٹی خشک ہوتی ہے
اُدھر سب لوگ مل کر نچلی منزل چھوڑ دیتے ہیں
کہ جب منزل مکمل ہو تو زینہ توڑ دیتے ہیں
مگر بنیاد میں اب بھی
تجسّس کا چمکتا کوندتا سنگِ ستارا ہے
ہوس کا لوچ دیتا سنگِ لرزاں ہے
پھر اک سنگِ سلیماں ذاتی ملکیت کا ہے
اور آخری سنگِ شجر ہے جس پہ کائنات کا شجرہ بنا ہے
اور انساں اس کے مرکز میں نمایاں ہے

کولاژ

اُس نے مٹھی کے گلداں میں ٹہنی رکھی
پتیوں کے کنارے چمکنے لگے
پھول بھرنے لگے اور چھلکنے لگے

اُس نے پاؤں دھرے گھاس کے فرش پر
پاؤں کا دودھیا پن سوا ہو گیا
سبزہ پہلے سے زیادہ ہرا ہو گیا

اُس نے دیکھا اماوس بھری رات کو
رات کے سنگِ خارا میں روزن ہوا
نور جوبن ہوا چاند روشن ہوا

اُس نے اِک بیضوی سا اشارہ کیا
سوچ کی مستطیلیں پگھلنے لگیں
خواہشوں کی تکونیں بھڑکنے لگیں

جب سلیٹ آسماں کی تپکنے لگی
اُس نے بارش لکھی پور کے چاک سے
دستِ نمناک سے لمسِ بے باک سے

اُس نے رحلِ دہن پر سخن جو رکھا
ہر سماعت کے پردے کو جزداں کیا
شاملِ جاں کیا جزوِ ایماں کیا

اُس کو چھو کر ہوا جو مسافر ہوئی
بانس بن سارا مرلی منوہر کیا
سیپ گوپی ہوئی رقص جوہر ہوا

وقت تہہ دار کاغذ کا پتلا ہوا
بُرج اس کے اشاروں پہ چلنے لگے
رات دِن اُنگلیوں پہ نکلنے لگے

گیلے ساحل نے جب اس کے پاؤں چکھے
اُس کے نمکیں لبوں میں فتور آ گیا
بحر کو ذائقے کا شعور آ گیا

اُس نے بھادوں کے اُبٹن سے چہرہ رنگا
قوس رنگیں کو گردن پہ زیبا کیا
نرم سورج کی ٹکیا کو بندیا کیا

مَیں نے چٹکی سفوفِ شفق سے بھری
پھر پڑھا اُس کی آنکھوں کی تحریر کو
بھر دیا کامنی مانگ کے چیر کو

ہم نے شاخِ شبستان سے لمحے چنے
اُس نے اُجلی کلائی کو گجرا دیا
مَیں نے بحرِ تمنّا کو بجرا دیا

کیسا لگتا ہے؟

تم کو اپنے آپ میں کیسا لگتا ہے
تم اپنے دیوار و در میں رہتی ہو
اپنے جسم کے گونجتے گھر میں رہتی ہو
تم کو اپنے آپ میں کیسا لگتا ہے

اپنے جسم سے باہر آ کر تم نے کبھی
اپنی کمر پر بال لٹکتے دیکھے ہیں؟
سامنے آ کر
ہاتھوں میں چہرہ لے کر
رنگوں کے اطوار بدلتے دیکھے ہیں
تم نے پشت پہ گردن کی کاندھے کے قریب

سوتا جاگتا جل بجھتا تِل دیکھا ہے
باتیں کرتی، بے خود ہنستی حالت میں
اپنی ہر جنبش کو شامل دیکھا ہے
اور جو دیکھا ہے تو کیسا لگتا ہے
اور نہیں دیکھا تو کیسا لگتا ہے؟

آدھا رُومال

کتنے پہاڑ اس ایک اکیلے شخص پہ ٹوٹے
لیکن پتھر پھاڑ کے وہ ہر بار زمین سے باہر نکلا
ضبط کی گیلی مٹی اپنی سرخ خراشوں پر پھیلائی
ابھی کھرنڈ اُگنے ہی لگتے تھے
کہ اگلا کوہِ گراں سر پر آتا تھا
آخر اس کی حالت یوں تھی
جیسے مزار کے پیڑ پہ منّت مانگنے والوں کے رنگیلے پارچے
ہوا کے گھاؤ، پتوں کے ٹکراؤ اور کانٹوں کے شر سے
لیراں لیراں لہراتے ہیں
دھجّیاں ہو کر اُڑ جاتے ہیں

اُس بازار میں پان کی سرخ دکانیں تھیں
چھڑی چھڑی سے موتیے اور گلاب کے ہار ٹپکتے تھے
تو ہار فروشوں کے جوتے گیلے ہوتے تھے
بالا خانے روشن تھے اور ان کی سیڑھیاں اندھی تھیں
بند اور کھلے کواڑوں سے

درزوں اور دراڑوں سے
گھنگھرو گھنگھرو جھنک زمین پہ گرتی تھی
تو مشروبات کی تہوں میں لہریں جاگتی تھیں

اس نے ایک پرانے زینے پر جب اپنا پاؤں رکھا
تو سیڑھیوں نے خود اس کو اوپر کھینچ لیا۔
وہ بیٹھی تھی
یوں بیٹھی تھی جیسے بیٹھنے والے بیٹھا کرتے ہیں
ان کی مدھم آس میں جن کو گانا سننا آتا ہے

دونوں کی آنکھوں نے اِک لخطے میں صدیاں بھر کر دیکھا
سب سے پہلے سارنگی نے رونے کا آغاز کیا

پھر گانے والی کی آواز نے ماتمی جوڑا پہن لیا
اور زرد آلاپ نے اپنے سر میں مارا ٹھاٹھ کی مٹّی ڈالی
سازندوں کی سسکاری نے، طبلے کی دھڑکن پہ خون کی چھینٹا پھینکا:
''ایک غزل پیشِ خدمت ہے''

جب بھی لوگ بہم روتے ہیں
اپنا اپنا غم روتے ہیں
دِن میں خوشبو ہنسنے والے
راتوں کی شبنم روتے ہیں
کربل جن کے سینوں میں ہے
کرتے ہیں ماتم، روتے ہیں
بادل ہاتھ بٹا دیتا ہے
ساون میں ہم کم روتے ہیں
شیش ہوئے ہیں لوگ جہاں کے
پھن ہنستے ہیں، سم روتے ہیں
بات وحید احمد سیدھی ہے
کیوں ہم پیچ و خم روتے ہیں

سازندوں کی پوریں روئیں، اور گانے والی کی آنکھیں
سننے والے کی تو خیر آنکھوں کی کنجیں سالہا سال سے ڈھلک گئی تھیں
جن میں آنسو بڑی سہولت سے بہتے تھے
سننے والے نے گانے والے کی آنکھوں پر اپنا رومال رکھا
تو نمی ہتھیلی میں آ لرزی
اُس نے سوچا
کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ بہم روئیں اور اِک دوجے
کا غم روئیں؟
کیا اِک غم کی لہر کسی کے غم کو بھی مَس کر سکتی ہے؟
کیا اِک جھونکا پتوں سے کھے کر گزرے تو ان کے
ساتھ چپک سکتا ہے؟''
اس کے بعد اُس نے رومال اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا

لہر نے لہر کو جذب کیا اور جھونکا پتوں سے آ چپکا
پھر اُس نے رومال کو پھاڑا
آدھا گانے والے کے قدموں میں رکھا
اور آدھا اپنی جیب میں ڈال کے واپس سیڑھیاں اُتر گیا

THE DIVE

نیل سیمابی،
لرزتی، سرد سطحِ آب سے بس اِک تماشا فاصلے پر
چوب کا تختہ معلق تھا
وہ جس پر نم سہولت سے بھری
اِک بے نیازانہ سنبھلتی چال چلتی
چوب کے ہموار لچکیلے کنارے پر پہنچ کر مڑ گئی
ایسے۔۔۔ کہ دونوں ایڑیاں گیلی ہوا پہنے ہوئے تھیں۔
سوئمنگ پول کی جانب اب اُس کی پشت تھی
جس کی پناہی منتظر پانی کا ہلتا نیل کرتا تھا

کفِ پا قوس بن کر ایڑیوں کو رفعتیں دیتے اُٹھے
تو ساقِ سیمیں کے ابھار افزوں ہوئے
پھر اِک تناؤ
جسم کی لچکیل پر چلتا
کمر کی ایستادی کو کماں کرتا
صراحی دار گردِن کے خم و چم کو کماں سازی عمل میں صرف کرتا
کاسۂ سر کی رکاوٹ میں رُکا۔۔۔
ورنہ کماں قوسِ قزح سے جا ملی تھی
جس کو سورج نے دُھلے آکاش میں پھیلی ہوئی
بھیگی لرزتی شام پر پھینکا ہوا تھا

خود کفالت کا یہ عالم تھا
کہ اُس نے جست بھرنے کے لیے
اپنے بدن کی نرم لچکیلی کماں کھینچی
اور اپنے ہی قد و قامت کا جستی تیر چھوڑا
چوب کے تختے نے اِک تھرائی حیرت سے
کماں کو تیر بنتے اور پھر اِس تیر کو پرواز میں دیکھا

ہوا میں ایک چکر کاٹ کر
جب جسم کی چاندی، سوئمنگ پول کے نیلاب تک آئی
تو باز و دست بستہ رہنمائی کر رہے تھے

قسم ہے چشمِ حیرت کی
وہ یوں پانی میں چلتی جا رہی تھی
نیند کے صفحے پہ جیسے خواب کی تحریر چلتی ہے
قسم چشمِ تماشا کی،
وہ ایسے تیرتی تھی
جس طرح پگھلے ہوئے شیشے میں کوئی عکس چلتا ہے
۔۔۔کوئی تصویر چلتی ہے

کیوں؟

بچے ہم سے بہت بڑے ہیں
بچوں کو ہنسنا آتا ہے
سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک تھرتھر ہنستے ہیں
سرخ زبان معلّق کر کے
دانتوں کی کم مائیگی اور نمایاں کر کے
مٹھّیاں بھینچ کے
گردن کھینچ کے
ایک ہی سانس میں قہقہہ توڑ کے، سینے کو کسنا آتا ہے
بچوں کو ہنسنا آتا ہے

بچوں کو رونا آتا ہے
چہرے کے تیور پگھلا کر
ماتھے پر شکنیں بکھرا کر
آنکھوں کی درزوں میں پلکوں کی بھیگی جھالر اُلجھا کر
لب پھیلا کر
ٹھوڑی اُٹھا کر
ہچکی ہچکی سانسوں کو آنسو آنسو دھونا آتا ہے
بچوں کو رونا آتا ہے

پھر حیراں ہونا آتا ہے
دانتوں میں ششدر اُنگلی کی پور دبا کر
چہرے کے تیور ٹھہرا کر
آنکھیں، گویا چہرے کے قرطاس پہ اِک پرکار گھما کر
کسی نے جلدی سے رکھ دی ہیں
حیراں دائرے، جن پر کبھی کبھی پلکیں سایہ کرتی ہیں
اُتھلی سانسیں، جن کو بے ساحل سوچیں گہرا کرتی ہیں
کتنے بے اوساں ہوتے ہیں

بچے جب حیراں ہوتے ہیں

ہم جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں
ہنستے ہیں تو کتنا ہنستے ہیں؟
روتے ہیں تو کتنا غم آنسو کرتے ہیں؟
حیراں ہوتے ہیں تو کتنا گم ہوتے ہیں؟
ہنسنا، رونا، حیراں ہونا فطری اور جبلّی ہے
تو پھر کیوں
ان کے اوپر جھلّی آ جاتی ہے
وقتی کالک جذبوں کو گہنا دیتی ہے
اوسی دھند برستی ہے۔ ہر شیشے کو دھندلا دیتی ہے
کیوں؟
آخر کیوں؟

مویشی

کریہہ الشّکل تھا جتنا، کریہہ الصّوت کچھ اس سے زیادہ تھا
دھکیل اُس کے بدن سے یوں ٹپکتی تھی
بھرے ساون میں جیسے آسماں کی چھت ٹپکتی ہے
وہ بس اِک ثانیے میں دیکھنے والی نظر کے نور چہرے پر خراشیں
ڈال دیتا تھا
تپکتے ملگجی چہرے کے میلے تھال پر داڑھی کی کھچڑی
زرد تر کاری جٹا کے پھیلتے سلین میں لتھڑی
اِک تسلسل سے
مِرے قلب و نظر کی اشتہا کو قتل کرتی تھی

پھٹی آنکھوں کے جنگل میں گھنیرے سرخ ڈوروں کے قبیلے
رقص کرتے تھے

جو کھدّر اُس نے اپنے جسم پر ڈالا ہوا تھا
وقت کی ناخن زنی کی زد میں آیا تھا
پھٹے بے سمت ریشے ہر خفی جنبش پہ گہرا سانس لیتے تھے

وہ میرے گھر کے سب سے قیمتی کمرے میں بِن پوچھے چلا آیا
کتب خانے کے اُجلے کارپٹ پر
سیاہ کیچڑ سے بھرے بوٹوں کو رگڑا
رَیک میں رکھی کتابوں کی قطاروں پر
غلاظت سے بھری نظروں سے تھوکا
اور میری سرخ آنکھوں میں سلگتے قہقہے کی ریت بھر دی
مَیں نے اِس ناقابلِ برداشت حرکت پر
گھما کر اپنے اُلٹے ہاتھ کا زنّاٹ اُس کے گال پر توڑا
تو وہ بولا

''مویشی!
تم کو چارا ڈالنے والے

تمھاری فصل کھاتے ہیں
جو تم نے تازیانے پیٹھ پر سہہ کر اُگائی تھی

مویشی!
پچھلے پاؤں پر کھڑے ہونا اگر سیکھا نہیں
تو سیکھ جاؤ
کام آئے گا

مویشی!
اِس کتب خانے کے دروازے کھولو
ہاں!
یہ دروازہ نہیں ہے جِلد ہے
اور اِس کے آگے اِک کتابِ زندگی ہے
جس کے لفظوں کی تہجّی دھجّیاں ہو کر
کہیں پھولوں پہ بکھری ہے
کہیں بادل پہ اٹکی ہے
ہوا کو کھینچ کر کمرے میں لے آؤ
پھر اُس کی شاخ سے اُن اَن چھوئے لفظوں کو توڑو

جن کے ناموں سے سماعت بے بصر ہے

مویشی!
تم یہ کونے میں دھری زنبیل میں نیلا سمندر کیوں نہیں بھرتے
فقط بجرے بناتے ہو
چٹختے پھول بَن کو اس کے اندر کیوں نہیں بھرتے
فقط گجرے بناتے ہو
تمھیں جلتے ہوئے بھڑکاؤ سے اتنا ہی مطلب ہے
کہ آتش دان جلتا ہے
تمھیں مٹّی کی وسعت سے بس اتنی ہی عقیدت ہے
کہ اس کے ایک تودے میں تمھارا سانس چلتا ہے''

یہ کہہ کر اُس نے میرا گُم جگالی دار چہرا
رحم کی نظروں سے دیکھا
پھر کتابِ زندگی کی جِلد اُلٹی
اور حرفِ معتبر بن کر
نہ جانے وہ ہوا کی شاخ کا پتّا ہوا
نیلے سمندر کا کوئی قطرہ بنا

مٹّی کا مادھو ہو گیا
بھڑکاؤ کا شعلہ ہوا
یا کیا ہوا!

یوں ہے کہ

کبھی قہقہہ ٹوٹا سانس کی ہلتی ٹہنی سے
کبھی آنکھیں چُورا چُورا ہو کر بہہ نکلیں
کبھی لفظ ہنسی کی گرد باد میں اُڑتے رہے
کبھی سسکاری نے آنچ بھری تو پگھل گئے
مَیں چھلک گیا، تو لفظ بھی سارے چھلک گئے
پھر ایک روز
مَیں ہنس نہ سکا تو مصرع ہوا
ہنس مکھ لفظوں کی بزم ہوئی
اور ایک روز
جب رو نہ سکا، یا ضبط کیا
تو نظم ہوئی

بَین

(والد کی وفات پر)

مجھے تُو اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر
ایک جھٹکے سے
ہوا میں پھینک دیتا تھا
کبھی گرنے نہیں دیتا تھا
جھک کر تھام لیتا تھا
مگر اِس بار تُو نے مجھ کو نیلے آسماں میں پھینک کر
نیچے زمیں رکھ دی
خدا پوچھے تجھے
تُو نے مجھے بے وقت منہ کے بَل گرایا ہے

زمیں کی ضرب سے میرا کلیجہ پھٹ گیا ہے
ہانپتی آنکھوں میں کانٹے،
کانپتے دانتوں میں مٹّی ہے
مجھے آنسو بہاتا دیکھ!
جس کو ہاتھ کی پوروں سے شیرینی کھلاتا تھا
اسے دھرتی چباتا دیکھ
او میرے وَیریا

بتا! جب سانس اُکھڑا تھا
بتا! جب جان گنّا تھی
اور اس پر بیلنے کا ڈر ڈراتا، گھومتا، بھاری شکنجہ کام کرتا تھا
بتا!
جب درد اُٹھا تھا ترے سینے میں بے دردا!
تو بیٹا یاد آیا تھا؟
جو اکثر باتوں باتوں میں کہا کرتا تھا
''بابا!
ڈھل گئے ہو

عُمر کی بھٹی میں لمحے جھونکتے، گھڑیاں جلاتے جل گئے ہو
بیٹھ جاؤ، تھک گئے ہو
چین کے دو دِن ہمارے ساتھ بھی کاٹو
کہ آخر ہم تمھارے ہیں۔۔۔۔"
تو بیٹا یاد آیا تھا؟
بھلا کس واسطے ہوتا ہے بیٹا؟
اجنبی کوچے میں بوڑھا باپ، بیگانی ہوا سے سانس کی خیرات مانگے
اور جواباً
پسلیوں کے کانپتے کشکول میں پتھر گریں
اِس واسطے ہوتا ہے بیٹا؟
بول او میرے وَیریا، کس واسطے ہوتا ہے بیٹا!
کس لیے ہوتی ہے چڑیاں (بیٹیاں)؟
شانت پیڑوں سے گرے تنکوں کو چونچوں میں لیے اُڑتی رہیں؟
بس آشیاں بندی کریں؟
بس وقت کی ٹہنی پہ بیٹھی اپنے بچوں کے چمکتے پَر اگائیں
رات دِن چوگا کھلائیں
اِس لیے ہوتی ہو چڑیاں؟

بول او میرے وَیریا، کس واسطے ہوتی ہیں چڑیاں؟

کس لیے ہوتی ہے بیوی؟
کانپتے بچوں کے جسموں پر دعاؤں کا ہَرا جزداں لپیٹے
گونجتے سنسار کے کہرے میں داغے
پھر جو منہ کھولے سویرا آ رہا ہے
اُس سے پنجہ آزمائی کے لیے اُجلی تسلی سر پہ رکھے؟
تو کہ ہرجائی تھا کوئی ہو بہو
کس لیے لایا تھا گھر میں تُو بہو؟
یہ۔۔۔کس لیے ہوتے ہیں سارے
اپنے اپنے گھر میں خوش بیٹھے رہیں۔۔۔بس؟
اور پھر جب سب
گھروں میں بیٹھ کر غم کا کسیلا پیاز کاٹیں گے
اور اس پر اپنی آنکھوں کا چھلکتا پور چھڑکیں گے
تو تیرا فلسفہ کس گھاٹ اُترے گا؟
او پتھرائے ہوئے پہلو بچا کر
بے نیاز آنکھیں جما کر

سب سے گہری نیند میں سوئی ہوئی مٹّی
تُو میرا باپ ہوتا تھا
مجھے کوئی طریقہ دے
تجھے مَیں کس طرح روؤں!
مِرے مرنے پہ میرا
بال بچّہ جس طرح روئے گا
کیا مَیں اُس طرح روؤں؟
کوئی بہتر طریقہ دے
او ٹھنڈی بے زباں مٹّی
کوئی بہتر طریقہ دے
او میرے وَیریا!

ہر مُلک مِلک ماست

اُندلس میں کشتیوں کو جلایا تو شور اُٹھا
یہ فیصلہ خرد کا نہیں ہے خطا کا ہے
ارضِ وطن سے دور ہیں کیسے پلٹ کے جائیں
در پیش اب تو مرحلہ ردِّ بلا کا ہے
طارق نے سونت کر کہا شمشیرِ خندہ زن
ہر ملک میرا ملک کہ میرے خدا کا ہے

(پیامِ مشرق سے فارسی نظم کا ترجمہ)

خانہ بدوش

نا مُشت میں میری مُشتری، نا پاؤں میں نیلوفر
نا زہرہ میری جیب میں، نا ہما اُڑے اوپر
نا دھڑکا ہے سرطان کا، نا زُحل کا کوئی ڈر
نا کوئی میرا دیس ہے، نا کوئی میرا گھر
نا ماتھے چمکے چندرما، نا تارا چھنگلی پر
پر دیکھ گلوب ہے گھومتا ، میری میلی اُنگلی پر

نا الکھ جگا سنسار میں، جب ماں کی کوکھ ہٹی
نا پپتک کھولی باپ نے، جب میری ناف کٹی
نا عمل کیا رّمال نے، نا دھن خیرات بٹی
نا بڑوں نے منتر تان کے، کوئی پاک زبان رَٹی
مَیں آپ ہوں اپنا زائچہ، مَیں آپ ستارہ ہوں
مَیں آپ سمندر ذات کا، مَیں آپ کنارہ ہوں

مرا مہد کجاوا اونٹ کا، مری لوری بانگِ درا
جھنکار جو چھڑکیں گھنٹیاں، تو رِستی جائے ہوا
ہے اوپر گولا ڈولتا، چمکیلے سورج کا
اور اُس کے اوپر آسماں ہے، گیلا نیل بھرا
مری بھور کٹی ہے کوچ میں تو سانجھ پڑاؤ میں
دِن ڈھور سموں کی ٹاپ میں تو رَین الاؤ میں

ہے وقت چھنکتی چال میں، پگ لمحوں کی پائل
تن چولا چھاؤں دُھوپ کا، سرست رنگی آنچل
مِرا مکّہ چمکے آنکھ میں بہے دِل میں گنگا جل
مَیں وایو، اگنی، سوریہ، مَیں بے ساحل جل تھل
مِرا ساتھی صبح و شام کا، مری ماں کا کنگن ہے
ہیں تکیہ اس کی چھاتیاں، تو گود سنگھاسن ہے

مَیں بالا بیلے دشت کا، صحرا میں ہوا جوان
مِرا جسم چھریرا سانولا، مری سیدھی تیر اٹھان
میری کالی آنکھ دراوڑی، متجسس اور حیران
مِرے نیند میں ہلتے پاؤں ہیں، میرے جذبے کی پہچان
اِک مشعل راہ نورد ہے، جو جلتی رہتی ہے
مِرے ہاتھ پہ ایک لکیر ہے، جو چلتی رہتی ہے

او دبی دبی سرگوشیو! لو سنو دراوڑ دھاڑ
ہم آسمان کا پارچہ، اِک پھونک سے ڈالیں پھاڑ
ہم کالے کوس اجال دیں، سنگلاخ پہاڑ پچھاڑ
ہم چلیں جو پورے پاؤں سے،تو دھرتی کھائے دراڑ
ہر اِک نشیب فراز کو، ہم ٹھوکر دیتے ہیں
جو خواب خیال گمان ہے، ہم وہ کر دیتے ہیں

انگشت بدنداں راستے، دل پاش کلیجے شق
تن سم ضربوں سے نیلگوں ، اور چہرا چہرا فق
ہوں شیشہ شیشہ دھاریاں، یا ریگ کدے لق لق
مَیں اکبرِ اعظم راہ کا، مَیں منزل کا تغلق
میرا تن ہم زاد الاؤ میں دربار لگاتا ہے
ہر رستہ جسم سنبھال کے تسلیم کو آتا ہے

او مانگ بھری مری کامنی مرے ساتھ جوانی چکھ
یہ جگ تیری جاگیر ہے ،تُو کھل کے پاؤں رکھ
اس ورق ورق سنسار کو، تُو کھول پھرول پرکھ
رہیں سدا یہ نورواریاں، ہے جیون نقش اَلکھ
آ پاؤں پہ مٹّی باندھ لیں ، آ ہوا ہتھیلی پر
آ اسمِ سم پھونک دیں اِس جنم پہیلی پر

سنسار سفارت گاہ میں، مرے ڈھور ڈنگر مندوب
ہیں دلدل دشتی راستے، تو تیز ہوا پاروب
ہوں اونچی شرق شمالیاں، یا گہرے غرب جنوب
انھیں ساری سمتیں ایک ہیں انھیں سب راہیں مرغوب
بے جان زمین پہ زندگی کی ٹاپ جو پڑتی ہے
تو سہمے سہمے راستوں کی سانس اُکھڑتی ہے

اودھرتی کھول ہتھیلیاں مَیں پاؤں سے کھینچوں رَیکھ
مِرے کٹے پھٹے پاپوش ہیں، پر نقش نگاری دیکھ
مَیں کُنڈلی ہوں تاریخ کی ،مَیں جنم جنم کا لیکھ
مَیں بانجھ زمین کا سنبلہ،مَیں زرد رُتوں کا میکھ
اِک خیرہ خیرہ روشنی چھاؤں میں ہوتی ہے
یہ دنیا جس کا نام ہے،مرے پاؤں میں ہوتی ہے

مَیں سنگ نہیں انسان ہوں، کیوں گھر تعمیر کروں
جب پاؤں لگے ہیں جسم کو،تو کیوں نہ چلوں پھروں
جب عجلت میں ہے زندگی، تو کاہے دھیر دھروں
میں کیسے اینٹیں جوڑ دوں، میں کیوں بنیاد بھروں
اِس دھرتی کی بنیاد پر، میں جسم اُٹھاتا ہوں
گھر سایہ بن کر ساتھ ہے، میں جہاں بھی جاتا ہوں

میں پگمی، بدّو، نیگرو میں ہوں منگول، افغان
اس صبح بحیرہ روم تھا، اس شام ہوں راجستھان
ہے سڈنی قرب و جوار میں، کبھی پہلو میں ایران
دریائے زرد میں کشتیاں، ڈینیوب پہ کبھی پڑاؤ
اک نقشِ پا رومانیہ، تو اک قفقاز میں ہے
اک سانس ہے مالا بار میں، تو ایک حجاز میں ہے

مَیں شاعر ساندل بار کا، مری سوچیں خانہ بدوش
جب کرے سلیماں معجزہ، تو دِنیا سے روپوش
پی ساوی بری امام کی، تو من موجی مدہوش
کبھی سارا دھارا آئینہ، کبھی پورن ماشی جوش
یہ چہرے سوج دار ہیں لشکارا ہوتے ہیں
یہ لوگ جو ہیں بے خانماں، مرا سارا ہوتے ہیں

(علی ارشد میر کی پنجابی نظم سے ماخوذ)

پھیلاؤ

ستاروں کا دُھواں پھیلا ہوا تھا
خرد پر آسماں پھیلا ہوا تھا
مگر جب اپنے اندر میں نے دیکھا
کرانِ بیکراں پھیلا ہوا تھا

(پیامِ مشرق سے فارسی رباعی لالۂ طور کا ترجمہ)

لکیر میں رہ

''او رات
آ
میرے سامنے بیٹھ
طے کیا ہے
کہ تیری پیمائش آج پیمانے سے کروں گا''
یہ کہہ کے میں نے بھرا ہوا جام چاند کے کانچ سے ملایا
تو چاندنی ٹمٹما کے کہنے لگی
''چیئرز
آج دیکھنا ہے کہ رات جیتے گی
یا کسی بد دماغ کی ایک بات جیتے گی
دیکھنا ہے''

مقابلہ چاندنی کے اُجلے سٹیڈیم میں جما ہوا تھا
کروڑوں تارے چمکتی آنکھیں جھپک رہے تھے
ہزار ہا دودھیا پھریرے پھڑک رہے تھے
وہ جن کے کرنوں کے پارچے میں
مہین تاروں سے کہکشائیں کڑھی ہوئی تھیں
فضا میں مہتابیوں کے آتش فشاں پھٹے تھے
تمام رنگوں کے جگنوں سے،
دُھلی ہوئی رات اٹ گئی تھی
میں رات کا تھان کھول کر ناپتا رہا
اور وہ بڑی بے بسی سے نپتی رہی
نہ اس نے مزاحمت کی
نہ کسمسائی
نہ جھرجھری لی

کسی کی موقعہ شناس پوروں نے
دھیرے دھیرے
ستار کے تار تار پر

انتہائی کاریگری سے ایمن کا خیال باندھا
تو کھال کے دائروں پہ طبلہ نواز پوروں نے
پھڑ پھڑاتے پرند کھولے
خمار بڑھنے لگا
تو اس کے مقابلے میں اس تناسب سے
چاندنی کا غبار بڑھنے لگا
تھرکتی
لرزتی پوروں کا رقص چلنے لگا
تو مستی کے آئینے میں
مچلتی سوچوں کا عکس چلنے لگا
بالآخر
وہ وقت آیا کہ کیف اک کیفیت میں بدلا
ہوا کے جھولے تھے
اور ان میں HALLUCINATIONS ہل رہی تھیں
خیال کی ڈولتی ڈگر پر DELIRIUM ڈگمگا رہا تھا
غرور پورے غرور میں تھا
کمال حدِّ کمال پر تھا

ہر اک مخاطب تھا، میں نے جب چیخ کر کہا
''کوئی ہے
جو میرے مقابل آئے؟
تمام دُنیا سے میری للکار پوچھتی ہے!''

تو میری مَیں میرے جسم کے سامنے کھڑی ہو کے بولی
''ہے
جو مقابل آئے
یہ دیکھ
ہے
اور سامنے ہے!
وحیدؔ احمد!
لکیر میں رہ
کہ تیری سوچوں کی ایک حد ہے
بس ان سے آگے ذرا بڑھا
تو
تمام عمر اپنے آپ کو ڈھونڈتا رہے گا

سریر میں رہ
ابھی تری رُوح تیرے ملبوس سے ذرا ہٹ کے جھولتی ہے
اگر یہ جھولا جھلاؤ میں آ گیا
تو کیا ہوگا
تُو کہ شاخِ بدن میں رہتا ہے
جانتا ہے
قصور تیرا نہیں ہے، تیرے جنون کا ہے
جنون
حصّہ اَزل سے تیرے بدن کے بے چین خون کا ہے
ہزار ہا سال پہلے
جب تیرے وحشی آباء
جنگلوں میں کسیلے جَو کی شراب پی کر
ہرن کا کچّا شکار کھاتے
تو اُن کی روحیں بھی جھولتی تھیں
وہ چاند راتوں میں اپنے نیزے
ہوا میں اِس زعم سے چلاتے
کہ اُن کی انیاں بس ایک پل میں

ہوا میں لٹکی سفید تھالی کو پھاڑ دیں گی
مگر کہاں!
رات ایک خواہش میں بیت جاتی
پھر اگلے دِن اُن کی آنکھ کھلتی
تو جسم ہوتا خمارِ رفتہ سے پارہ پارہ
دماغ
ناکام چاند ماری سے ریزہ ریزہ
تو ان پہ کھُلتا
کہ چاند آخر کو چاند ہوتا ہے، نیزہ نیزہ

تو سب سے پہلے وہ اپنے نیزوں کو ڈھونڈتے
اُن کی ٹیڑھی انیوں کو سیدھا کرتے
پھر اُن کی نوکیں نکالتے تھے
کہ وہ اِنہی جگمگاتی نوکوں سے اپنے بچوں کو پالتے تھے

لکیر میں رہ
کہ تیری سوچوں کی ایک حد ہے
تو رات کو ناپنے چلا تھا

کہ رات دِن پیدا کرنے والے کی

ذات کو ناپنے چلا تھا

وحید احمد!

کسی کا قد ناپنے سے پہلے

بہت ضروری ہے آئینے سے رجوع کرنا

کبھی جو رات اپنی جگمگاتی سیاہ بالشت کھول دے

تو پتہ چلے گا

کہ اِس کے آگے تو کہکشاؤں کا قد نہیں ہے

یہ رات ہے

اور رات کی کوئی حد نہیں ہے!

لکیر میں رہ‘‘